ڈاکٹر ظفر احمد
استاد شعبہ اردو،نیشنل یونیورسٹی آف ماڈرن لینگویجز، اسلام آباد

اُردو ہندی تنازعہ اور اُردو رسم الخط

Dr. Zafar Ahmed

Assistant Professor, Department of Urdu, NUML, Islamabad

Hindi-Urdu controversy and Urdu Graphemes

Studies of graphemes in Urdu started during last quarter of 19th century. There are many contextual elements we find but basically it was political situation of the sub-continent which was playing the major role. After 1857 the socio political scenario of India changed and Hindus and other identities started coming in prominence. They wanted to undo many things happened during almost thousand years long Muslim rule. The Urdu Language and its graphemes are one of their main targets. Like Sir Syed Ahmed Khan many Muslim stood in front of such oppositions and they strongly promoted and fortified Urdu. In this article initial works of Urdu grapheme have been discussed in this context.

اردو میں حروف تہجی اور املا کی بحث علمی سطح پر انیسویں صدی کے نصف آخر میں شروع ہوئی۔ یوں تو ان مطالعات کے پس پردہ کئی عوامل فعال نظر آتے ہیں البتہ بنیادی طور پر اسے سیاسی بحث قرار دے سکتے ہیں۔ ۱۸۵۷ء کے بعد جب مغل سلطنت کا خاتمہ ہوا اور ہندوستان ایسٹ انڈیا کمپنی کے ذریعے تاج برطانیہ کے زیر نگیں آگیا، تب مغلوں اور مسلمانوں سے وابستہ ایک پوری تہذیب زوال آمادہ ہوئی۔ اس دوران یہ خطہ شدید قسم کی تبدیلیوں کی زد میں رہا۔ ان سے جہاں فرد متاثر ہوا وہاں اس سے منسلک ہر شے بھونچال کا شکار ہوئی۔ زبان بھی اس معاشرے کا ایسا ہی شعبہ تھا جو نئے حالات میں نئے پیراہن اختیار کرنے لگتا ہے۔ دیگر ہندوستانی زبانوں کے برعکس اردو بولنے والے اپنی زبان کی اس تبدیلی کے عمل میں مزاحم ہوئے۔ اس مزاحمت کی بنیاد یہ تھی کہ اردو زبان ان کے اسلاف کی نشانیوں میں سے ایک تھی۔ اس زبان کو ان کے بزرگوں نے سجایا

سنوارا تھا اور اسے ادبی زبان کے درجے تک لے آئے تھے۔ اسی زبان میں ان کا بیشتر علمی و ادبی ورثہ محفوظ تھا۔ ایک اور اہم وجہ یہ تھی کہ اس زبان میں اب اس قدر عربی، فارسی اور ترکی اثرات شامل ہو گئے تھے کہ انہیں لگنے لگا کہ اس واسطے ان کا رابطہ ایران و عرب سے قائم رہے گا۔ ان خطوں کو بحیثیت مسلمان وہ اپنا فکری و علمی سرچشمہ تصور کرتے تھے۔ زبان کی نئی صورت قبول کرنے سے انہیں اندیشہ تھا کہ یہ رابطہ ٹوٹ جائے گا۔

دوسری جانب نئے ہندوستانی معاشرے میں ہنود جو اکثریت میں ہونے کے باوجود ایک مدت سے پس منظر میں رہتے چلے آئے تھے، انگریزوں کے زیر سایہ ابھرنے لگتے ہیں۔ اقتدار کا قرب حاصل ہوتے ہی وہ کئی ناپسندیدہ عوامل کو راہ راست پر لانے کے لیے کمربستہ ہو جاتے ہیں۔ اردو زبان بھی ان کے مطابق گزشتہ ادوار میں اپنی راہ کھو چکی ہے۔ یوں وہ اس کی تراش خراش پر آمادہ ہو جاتے ہیں۔ حالانکہ اس زبان کو وہ ایک عرصے سے قبول کر چکے تھے۔ ان کے مطابق اس زبان میں غیر ضروری طور پر بیرونی اثرات مرتب ہوئے ہیں۔ جن سے اس کو پاک کرنا ضروری ہے۔ یوں پہلے تو وہ اس زبان کے نام اور اس میں عربی، فارسی اثرات کے خلاف محاذ کھولتے ہیں اور پھر بعد میں اس کے رسم الخط پر اعتراض کرتے ہیں۔ یہی دراصل وہ نقطہ آغاز ہے جہاں سے اردو رسم الخط و حروف کے مطالعے کا آغاز ہوتا ہے۔ ہنود کے ان اعتراضات کا جواب بذریعہ دلیل و ثبوت دینے کے لیے نیز مسلمانوں میں اس زبان کی اہمیت اور اس کے مندرجات کی شناخت و ابلاغ کے لیے رسم الخط و حروف کے مطالعے کا عملاً آغاز ہوتا ہے۔ اردو۔ ہندی تنازعے کی تاریخ اور اس کے اثرات پر اردو میں کئی اہم اور وقیع کتابیں سامنے آچکی ہیں۔

بہت سے مورخین کا خیال ہے زبان کی تبدیلی کا آغاز کلکتہ میں قائم فورٹ ولیم کالج سے ہوا۔ انگریزوں نے اس کالج میں ہی زبان کے ذریعے ہندوؤں اور مسلمانوں کے درمیان نفاق کا بیج بو دیا تھا۔ جب تک مغل سلطنت کا دیا ٹمٹماتا رہا ان سرگرمیوں کی کوئی واضح شکل نہ ابھر سکی۔ لیکن جنگ آزادی کی ناکامی کے بعد مغل حکومت کا چراغ بجھ گیا اور جس کے نتیجے میں ہندوستان پر کمپنی کی حکومت قائم ہو گئی۔ انگریزوں کے اقتدار کا سورج چڑھتے ہی ہندوؤں نے اردو زبان سے عربی، فارسی اثرات کے خاتمے کے لیے باقاعدہ جدوجہد کا آغاز کیا۔ یوں لسانی مسئلہ پہلی بار بڑے پیمانے پر شدت کے ساتھ سر اٹھاتا ہے۔ 'بنارس کی ہندی پرچارنی سبھا کی سی متعدد انجمنیں سیاسی محاذ پر سرگرم عمل ہو گئیں اور گورنر میکڈونلڈ کی استعماری سیاست اور گریرسن کا لسانی استعمار ان انجمنوں کی سرپرستی کو اپنا قومی فریضہ سمجھنے لگا۔'(۱)

ہندوؤں نے ہندی کی ترقی اور اسے دوبارہ زندہ کرنے کے لیے کئی تنظیمیں قائم کیں۔ ان تنظیموں نے ہندی زبان کے احیاء کو اپنا مقصد اولین بنایا اور ہر سطح پر ہندی زبان کی حمایت، اسے بیرونی اثرات سے پاک کرنے اور اسے اردو پر سبقت دلانے کی کوششیں شروع کیں۔ 'برہمو سماج' جس کے بانی راجارام موہن رائے تھے نے نئے ملکی حالات کا تقاضا سمجھتے ہوئے اصلاح مذہب کا بیڑا اٹھایا اور اس میں کافی کامیابی بھی حاصل کر لی۔ دوسری طرف 'آریا سماج' اس کے رد عمل میں وجود میں آئی۔ یہ ایسی تحریک تھی جس کے ذریعے 'برہمو سماج' اور اور اسلامی اثرات سے ہندومت کو پاک کرنے کی کوششیں ہوئیں۔

اس کا بنیادی مقصد ہندو مت کی قدیم روح کا احیاء اور نئے نظام کو اس کے مطابق کرنا تھا۔ آریا سماج تحریک نے لسانیات میں نزاعی کردار ادا کیا اور اردو پر ہندی کو سبقت دلانے کی کوشش کی۔ دیانند سرسوتی نے ہندی کو ہندوؤں کی مذہبی زبان قرار دیا۔[۲] دیانند سرسوتی نے ہندی کو پورے ہندوستان میں رائج کرنے کی کوشش کی۔ زبان کی شدھی کا اولین نمونہ دیانند سرسوتی نے اپنی تصنیف 'ستیارتھ پرکاش' میں پیش کیا اور عربی اور فارسی کے مقبول الفاظ کو چن چن کر نکالا اور ان کی جگہ سنسکرت کے بھاری بھرکم الفاظ استعمال کیے۔[۳]

'اس تنظیم کے نزدیک ہندی آریا بھاشا تھی اور اس کا فروغ ہر ہندو کا مذہبی فریضہ تھا۔'[۴]

دنیا کی رائج اور ترقی یافتہ زبانوں کی تاریخ میں اس طرح کی مثال شاید ہی ملے۔ یہ اردو ہی ہے جس نے اپنے ارتقائی سفر میں اس قدر اتار چڑھاؤ دیکھے۔ ہنود کی جانب سے زبان کو شدھ کرنے کے بعد اس کے رسم الخط کی باری آئی، اور اسے تبدیل کرنے کا مطالبہ شروع ہوا۔ یہ معاملہ اٹھانے والوں میں 'سناتن دھرم تحریک' کے رہنما پنڈت شردھارام پیش پیش تھے۔ 'سناتن دھرم تحریک نے اس نظریے کو مزید ہوا دی اور ہندی بھاشا کو دیوناگری حروف میں رائج کرنے کا مطالبہ کیا اور حصول مقصد کے لیے بنارس میں 'ناگری پرچارنی سبھا' اور الہ آباد میں 'ہندی ساہتیہ سمیلن' قائم کیے گئے۔'[۵] ایک طرف جہاں اردو کو ہندوؤں کی جانب سے کئی حملے سہنے پڑے وہاں دوسری جانب بعض مورخوں کے مطابق انگریزوں نے ایک پالیسی کے تحت ایک زبان کو دو ٹکروں میں تقسیم کیا۔ 'گورے کی لسانی سازشوں کے نتیجے میں اردو اور ہندی میں بھی حد فاصل پیدا ہوئی۔ ایک طرف یہ فاصلہ بڑھتا گیا تو دوسری سمت دفتری ہندی ہوتی چلی گئی۔'[۶]

اردو کے دفاع میں جہاں انفرادی سطح پر کام ہوئے وہاں بعض اداروں اور انجمنوں نے بھی اس سلسلے میں اہم کردار ادا کیا۔ دہلی کالج، علی گڑھ کالج اور جامعہ عثمانیہ کے نام اس ضمن میں نمایاں ہیں۔ ان اداروں نے اردو کو ادبی و علمی حوالوں سے ثروت مند بنانے میں اپنا کردار ادا کیا۔ علی گڑھ کالج کا کردار اس تحریک میں سب سے نمایاں ہے۔ اس ادارے کے بانی اور روح رواں سرسید احمد خان تھے۔ سرسید ابتدا میں ہندوستانیوں کی فلاح کے لیے کوشاں تھے۔ وہ مسلمانوں یا یہاں آباد کسی دوسرے گروہ میں کوئی فرق روا نہیں رکھتے تھے۔ یہ صورتحال زیادہ دیر قائم نہ رہ سکی۔ سرسید کو اپنا لائحہ عمل بدلنا پڑا اور اس فیصلے کے پس پردہ بھی بنیادی کردار زبان نے ہی ادا کیا۔ فورٹ ولیم کالج سے شروع ہونے والے تنازع نے ۱۸۵۷ء کے بعد شدت اختیار کر لی۔ 'چنانچہ ۱۸۶۷ء کے سال کو اس تحریک میں یہ اہمیت حاصل ہے کہ اب سرسید کے دل میں مسلمانوں کی الگ قومی حیثیت کا خیال جاگزیں ہو گیا۔ سرسید کی زندگی میں جنگ آزادی کے بعد یہ دوسرا بڑا حادثہ تھا۔'[۷]

'اس سال بنارس کے بعض سربرآوردہ ہندوؤں کو یہ خیال پیدا ہوا کہ جہاں تک ممکن ہو تمام سرکاری عدالتوں میں سے اردو زبان اور فارسی رسم الخط کے موقوف کرانے کی کوشش کی جائے اور بجائے اس کے بھاشا زبان جاری ہو جو دیوناگری میں لکھی جائے۔'[۸] اس فعل سے جہاں ایک طرف ہندوؤں کی مسلم دشمنی عیاں ہو گئی تو دوسری جانب ان کے دلوں میں اردو کے

لیے پائی جانے والی نفرت بھی آشکار ہوئی۔ ' ۱۸۶۷ء وہ یادگار سال ہے جس میں خود ہندوؤں کے ہاتھوں دو قومی نظرئے کی بنیاد رکھی گئی۔ ' (۹)

ان حالات میں سرسید دوراندیشی سے کام لیتے ہیں اور اپنی کوششوں کا دائرہ ہندوستان کے مسلمانوں کی فلاح تک محدود کر لیتے ہیں۔ وہ ہر محاذ پر اسلام اور مسلمانوں پر ہونے والے حملوں کا جواب دیتے ہیں۔ ہندوؤں نے ان حملوں کی ابتدا اردو پر حملوں سے کی تھی۔ ہندی زبان کی سرپرستی فرقہ ورانہ بنیادوں پر شروع کرنے کے ساتھ اردو کو مسلمانوں کی زبان قرار دیا گیا اور اس کے استیصال کے لیے ہر سطح پر سرگرمی دکھائی۔' سرسید نے اردو کی اس نئی حیثیت کو قبول کیا اور ہند اسلامی تہذیب کے اس شیریں ثمر کو تحفظ پہنچانے کی جدوجہد شروع کر دی۔'(۱۰) سرسید نے مسلم تہذیب کی نمائندہ زبان کے دفاع سے اپنا سفر شروع کیا۔ انہوں نے بنارس میں رہ کر اردو زبان اور اس کے خط ابجد پر کئے گئے اعتراضات کے مدلل جواب دیے۔ انہی کوششوں کے نتیجے میں شمالی ہندوستان کے سرکاری دفاتر میں اردو زبان بمع خط ابجد برقرار رہی۔

> یوں ہزارہا مسلمان جو بذریعہ اردو تحریر اور فارسی خط کے سرکاری نوکری کرتے تھے یا نوکری کے امیدوار تھے اور جن کو بڈھے طوطے کی طرح اب بھاشا زبان اور ناگری حرفوں کا سیکھنا اور اس میں امتحان دینا ایسا ہی مشکل تھا جیسا نیچر کا بدلنا، اس ناگہانی طوفان کے ریلے سے بچ گئے۔(۱۱)

ہندوؤں کی جانب سے اردو زبان پر ہونے والا پہلا اعتراض اس پر عربی، فارسی اور ترکی زبانوں کے اثرات کی وجہ سے ہوا۔ چونکہ یہ کام مسلمان حکمرانوں کے ادوار میں ہوا، لہذا ان اثرات کو بھی مسلم تہذیب کے کھاتے میں شمار کیا گیا۔ ہندوستان پر حکومت کرنے والے مسلمان حکمران ایرانی تھے یا تورانی۔ عربوں نے بھی ہندوستان کے بعض علاقوں کو پایہ تخت بنایا۔ حکمرانوں اور سرکاری زبان ہونے کی وجہ سے ان زبانوں کو ہمیشہ فوقیت حاصل رہی۔' اس کو ہمارے ہم وطن بھائیوں نے صرف اس بنا پر مٹانا چاہا کہ اس کی ترقی کی بنیاد مسلمانوں کے عہد میں پڑی تھی۔'(۱۲) ان مسلم حکومتوں اور صوفیائے کرام کی تبلیغ سے ہندوستان کی ایک بڑی آبادی مشرف بہ اسلام ہوئی۔ جس کے نتیجے میں زندگی کے دیگر معاملات کے علاوہ ان لوگوں کی زبانوں پر بھی متذکرہ زبانوں کے اثرات پڑے۔ اس کام میں تیزی مسلمان ادیبوں خاص کر شاعروں کی وجہ سے آئی۔ رہی سہی کسر اس وقت پوری ہوگئی جب یہاں کے مسلمانوں نے بعض مقامی زبانوں کے لیے عربی، فارسی خط یعنی ابجد اختیار کیا۔ اردو بھی ایک ایسی ہی ہندوستانی زبان تھی جس کے لیے ابجد اختیار کیا گیا تھا لہذا اس لیے اس میں فارسی الفاظ کی کثرت ہوگئی۔' برخلاف ہندی کے جو اپنے اصلی ماخذ یعنی سنسکرت کی طرف عود کر گئی۔ جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ موجودہ زمانے کی ادبی اردو اور ادبی ہندی میں زمین آسمان کا فرق ہوگیا۔'(۱۳)

علی گڑھ کالج میں اردو نصابی کتب کی تیاری کے سلسلے میں چونکہ اردو کو اولیت حاصل رہی لہذا ہندوؤں کی جانب سے اس طرف بھی تیر برسانے کا سلسلہ جاری رہا۔' اردو زبان کے مخالفوں نے اخباروں میں اس بات کی چھیڑ چھاڑ شروع

کر دی تھی کہ یونیورسٹی میں مسلمانوں کے لیے اردو زبان اور ہندوؤں کے لیے ہندی زبان مخصوص کی جائے اور باوجود تسلیم کرنے اس بات کے کہ ہندی زبان سرِ دست ترجمہ کی قابلیت نہیں رکھتی اس امر پر زور دیا جاتا تھا کہ اس کی ترقی میں کوشش کر کے اس کو ترجمہ کے لائق بنایا جائے۔'[۱۴] لیکن ان تمام مخالفتوں کے باوجود سر سید اپنے مقاصد کے حصول میں مگن رہے۔ یوں جہاں ایک طرف انہوں نے ہندوستان کے مسلمانوں پر احسان عظیم کیا وہاں اردو زبان و ادب بھی ان کے احسانات کے زیر بار نظر آتے ہیں۔ 'علی گڑھ تحریک نے نہ صرف ہندی زبان کے غلبے کو روکنے کی کوشش کی بلکہ اس نے لفظ کی داخلی حرکی قوت کو پہچانا اور انسٹی ٹیوٹ گزٹ اور تہذیب الاخلاق کے ذریعے اس قوت کو مثبت طور پر استعمال کیا۔'[۱۵]

اس مخدوش دور میں اردو کی حفاظت و ترقی کے لیے جہاں کئی اشخاص نے انفرادی و اجتماعی طور پر کارہائے نمایاں سرانجام دیے وہاں اردو کے فروغ کے لیے قائم ہوئے چند اداروں کا کردار بھی نظر انداز کرنے کے قابل نہیں۔ ان اداروں میں جدید تعلیم اردو زبان میں ہی ہوتی تھی۔ علمی حوالوں سے تراجم نے اردو کا علمی دامن وسیع ہوا۔ علی گڑھ اور دہلی کالجز کے علاوہ جامعہ عثمانیہ نے اردو زبان کو علمی حوالوں سے ثروت مند بنانے میں بھرپور حصہ ڈالا۔ 'حیدرآباد مسلم تہذیب کا گڑھ تھا اور وہاں دفاتر کی زبان اردو تھی۔ جامعہ عثمانیہ بنی تو تمام علوم و فنون کے لیے ذریعہ تعلیم کے طور پر اردو ہی کو اختیار کیا گیا۔'[۱۶] سر سید کے بعد اردو کے دفاع کی ذمہ داری اٹھانے والوں میں مولوی عبدالحق کا نام نمایاں ہے۔ مولوی صاحب کی زندگی پر نظر ڈالنے سے یہ بات عیاں ہوتی ہے کہ انہوں نے اپنی زندگی اردو زبان کی ترقی کے لیے تگ و دو کرتے اور اس زبان پر ہونے والے حملوں سے بچاتے گزار دی۔ 'جیسے سر سید کی وفات کے بعد اردو کا علم انہوں نے تھام لیا ہو۔ مولوی عبد الحق نے بھی سر سید کے نصب العین کو پنایا اور اسی کو اپنا مقصد بنایا۔ یعنی اردو زبان و ادب کی خدمت۔'[۱۷]

بیسویں صدی کا نصف اول ہندوستان کی تاریخ کا ہنگامہ خیز زمانہ ہے۔ ہندوستان کے لوگ مذہبی، سیاسی طور پر بیدار ہو گئے ہیں اور اپنے حقوق کے حصول کے لیے متحرک ہیں۔ علمی و ادبی میدانوں میں بھی بڑھ چڑھ کے حصہ لے رہے ہیں۔ ایک جانب تو باہمی رواداری اور اتفاق و اتحاد پر زور دیا جا رہا ہے تو دوسری جانب اس کام میں روڑے بھی برابر اٹکائے جا رہے ہیں۔ زبان کے سلسلے میں مولوی عبدالحق نے گاندھی جی اور کانگریس کی ہر سازش کا مقابلہ کیا۔ ۳۶-۱۹۳۷ء کا زمانہ اردو مخالفت کے لیے ایک بہت اہم زمانہ تھا۔ 'اس زمانے میں منشی پریم چند جیسا مستند اردو افسانہ نگار بھی اردو کی مخالفت پر کمر بستہ ہو گیا اور مخالفت میں کئی مضمون لکھے۔'[۱۸] اسی زمانے میں کانگریس نے ہندوستانی زبان کا پرچار شروع کیا۔ مولوی عبدالحق نے ہندوستانیوں کے عام مفاد میں اس نام کو ابتدا میں قبول کر لیا تھا البتہ گاندھی جی کے ان تاریخی جملوں کے بعد جو انہوں نے مولوی صاحب کے سامنے کہے تھے، مولوی عبدالحق کے سامنے سے اس ڈرامے کا پردہ بھی ہٹ گیا۔ کانگریس نے ہندوستانی ادب اور ادیبوں کے حالات سے واقفیت اور انہیں باہم قریب لانے کے لیے ایک تنظیم (اکھل بھارتیہ ساہتیہ پرشد) بنائی، جس کے بانی مسٹر کنہیالال منشی تھے۔ اس تنظیم کے سالانہ جلسے میں جو ۱۹۳۶ء میں گاندھی کی صدارت میں ہوا اور وہیں گاندھی جی کی اردو دشمنی سامنے آئی۔ اسی جلسے میں اردو کے حوالے سے گاندھی جی کے خیالات منتشر

ہوئے۔'گاندھی جی نے اردو کو مسلمانوں سے منسوب کرتے ہوئے اس کے خط کو بھی قرآنی حروف قرار دیا۔ نیز اس کے فروغ کو مسلمان بادشاہوں کھاتے میں شمار کیا۔'[۱۹] مولوی صاحب اس جلسے کے بعد اکھل بھارتیہ پرشد کمیٹی سے الگ ہوگئے۔ گاندھی جی کے اس بیان سے ان کی ذہنیت واضح ہوئی۔ یہاں مولوی عبدالحق کے عزم و حوصلے کی تعریف کرنا ضروری ہے۔' گاندھی جی سے ٹکر لینا یقیناً کوئی آسان اور معمولی دل گردے کا کام نہ تھا مگر مولوی عبدالحق نے اس معاملے میں گاندھی جی کا خم ٹھونک کر اور ڈٹ کر مقابلہ کیا۔'[۲۰]

پروفیسر گیان چند جین نے البتہ مولوی عبدالحق کے بیان کردہ اس جلسے کے احوال اور گاندھی جی کے بیان سے اختلاف کیا ہے۔ انہوں نے جو نکات اٹھائے ہیں وہ بھی نظر انداز کرنے کے قابل نہیں۔ مثلاً ان کے مطابق گاندھی جی کا مون برت تھا لہذا انہوں نے کوئی تقریر نہیں کی۔ دوسری بات یہ مولوی صاحب گراں گوش تھے۔ لیکن انہوں نے دیکھنے میں بھی غلطی کرتے ہوئے گاندھی جی کے ساکت ہونٹوں کو متحرک دیکھا۔' دو ہی صورتیں ہیں کہ حکیم صاحب نے ان کے مضمون میں اضافے کیے اور مولوی صاحب نے انہیں نہیں دیکھا۔ اگر دیکھا (بہ شمول قرآن کے حروف والا قول (تو اس کے معنی یہی ہیں کہ وہ خود اس سازش میں شریک تھے۔'[۲۱] پروفیسر گیان چند کے مطابق ایک دوسری صورت بھی ممکن ہے ۔ چونکہ 'اجلاس میں اختر حسین رائے پوری مولوی صاحب کے پاس بیٹھے تھے۔ انہوں نے مولوی صاحب کی خوشنودی اور قرب حاصل کرنے کے لیے یہ الفاظ مہاتما جی سے منسوب کر کے مولوی صاحب کو باور کرا دیے۔'[۲۲] ان کے مطابق جلسے میں مولوی عبدالحق نے اس بیان کے خلاف کچھ نہیں کہا۔ اپنی کتاب ' ایک بھاشا، دو لکھاوٹ، دو ادب' میں انہوں نے واقعے کا نئے اور مختلف پہلو سے جائزہ لیا ہے۔ ان کے الفاظ ہیں۔

> جلسے میں تو مولوی صاحب نے اس قول پر ایک لفظ نہ کہا لیکن بعد میں ملک بھر میں انجمن ترقی اردو نے بڑا طوفان مچایا اور رسالوں نے بہت سخت الفاظ میں اپنا تاثر ظاہر کیا۔ سب سے زیادہ درشتی قاضی عبدالودود نے دکھائی جو اس زمانے میں مسلم لیگ کے بڑے فعال کارکن تھے۔ ان کے الفاظ بعد میں پیش کروں گا۔ معترضوں نے یہ نہ سوچا کہ کیا کوئی سیاسی لیڈر ایسا بیان دے سکتا ہے کہ جس سے ایک بڑی قوم اس سے دور بھاگ جائے۔ مبینہ بیان کانگریس کے مستقل موقف کے خلاف ہے۔[۲۳]

پروفیسر گیان چند کی مذکورہ کتاب اردو دنیا میں کچھ زیادہ پذیرائی حاصل نہ کر پائی۔ ان کی کتاب کو اردو دشمنی اور ہندی دوستی کا علم بردار کہا گیا۔ اردو داں طبقے نے نہ صرف اس کتاب میں اٹھائے گئے سوالوں کے جواب دیے بلکہ پروفیسر گیان چند کی جانب سے کی جانے والی متنازع بیانات و تسامحات کا مدلل و علمی انداز میں جواب دیا گیا۔ البتہ اس جلسے اور مولوی عبدالحق کے ضمن میں کیے گئے مندرجہ بالا نکات کا جواب تاحال اردو والوں نے نہیں دیا ہے۔

اس مختصر جائزے سے اولاً یہ حقیقت عیاں ہوتی ہے کہ ہندوستان کے مسلمانوں نے کس قدر اس زبان کی ترقی اور اس کی ترقی و بقا کے لیے محنت کی۔ ثانیاً اس زبان اور اس کے رسم الخط اور حروف کے لیے ان کی محبت بھی نہایت بھرپور ہے۔ جہاں اس زبان نے ہندوستان کی تقسیم میں پس پردہ محرک کے طور پر اپنا کردار ادا کیا وہاں ہندوستانی مسلمانوں کو متحد ہونے میں اور اپنے لیے ایک الگ ریاست کا مطالبہ کرنے میں مدد دی۔ اس زبان کا دفاع کرتے کرتے اس زبان کے ادبی و علمی کے ساتھ ساتھ لسانی سرمائے میں بھی اضافہ کیا۔ اسی طرح اردو رسم الخط کا دفاع کرتے کرتے انہوں اس میں موجود خامیوں کو دور کیا اور اسے مزید بہتر بنایا۔ اس کے فنی و لسانی پہلوؤں پر توجہ کی اور اسے زمانے کے ہم آہنگ رکھا۔ رسم الخط کے ضمن میں تحقیقی و تنقیدی مطالعات کا سلسلہ قیام پاکستان کے بعد بھی جاری رہا۔ پاکستان میں اردو کے لیے ایک رومن خط اختیار کرنے کی تجویز بھی سامنے آئی۔ جس کے بعد اس خط کے حمایتی ایک بار پھر سرگرم ہوئے۔ لیکن اس کے ساتھ ساتھ رسم الخط کے حوالے سے علمی و لسانی تحقیقات بھی مسلسل اشاعت پذیر رہیں، اور یہ سلسلہ ہنوز جاری ہے۔

حوالہ جات

۱۔ فتح محمد ملک، پروفیسر (مرتب)، (پیش لفظ)، اردو زبان اور اردو رسم الخط، مقتدرہ قومی زبان، اسلام آباد، ۲۰۰۸ء

۲۔ عزیز احمد، بحوالہ ڈاکٹر انور سدید، اردو ادب کی تحریکیں، انجمن ترقی اردو، کراچی، اشاعت چہارم، ص ۲۸۲

۳۔ انور سدید ڈاکٹر، اردو ادب کی تحریکیں، انجمن ترقی اردو، کراچی، اشاعت چہارم، ص ۲۸۳

۴۔ سجاد ظہیر، سید، بحوالہ ڈاکٹر انور سدید، اردو ادب کی تحریکیں، انجمن ترقی اردو، کراچی، اشاعت چہارم، ص ۲۸۳

۵۔ انور سدید ڈاکٹر، اردو ادب کی تحریکیں، انجمن ترقی اردو، کراچی، اشاعت چہارم، ص ۲۸۳

۶۔ شاہدہ دلاور شاہ، ڈاکٹر، اردو زبان کا متنوع لسانی پس منظر اور چند مباحث، (مضمون) مطبوعہ :معیار، شمارہ ۹، جنوری ۲۰۱۳ء، بین الاقوامی اسلامی یونیورسٹی، اسلام آباد، ص ۵۲۹

۷۔ انور سدید، ڈاکٹر، اردو ادب کی تحریکیں، انجمن ترقی اردو، کراچی، اشاعت چہارم، ص ۲۰۴

۸۔ حالی، مولانا الطاف حسین، حیات جاوید، نیشنل بک ہاوس، لاہور، ۱۹۸۶ء ص ۱۳۸

۹۔ قدرت نقوی، سید، (مرتبہ)، لسانی مقالات، (حصہ دوم)، مقتدرہ قومی زبان، اسلام آباد، ۱۹۸۸ء، ص ۱۵۵

۱۰۔ انور سدید، ڈاکٹر، اردو ادب کی تحریکیں، انجمن ترقی اردو، کراچی، اشاعت چہارم، ص ۳۰۹

۱۱۔ حالی، مولانا الطاف حسین، حیات جاوید، نیشنل بک ہاوس، لاہور، ۱۹۸۶ء، ص ۳۳۶

۱۲۔ حالی، مولانا الطاف حسین، حیات جاوید، ایضاً، ص ۱۳۸

۱۳۔ رام بابو سکسینہ، ڈاکٹر، تاریخ ادب اردو، علمی کتاب خانہ، لاہور، ۱۹۸۲ء، ص ۲

۱۴۔ حالی، مولانا الطاف حسین، حیات جاوید، نیشنل بک ہاوس، لاہور، ۱۹۸۶ء، ص ۱۹۱

۱۵۔ انور سدید، ڈاکٹر، اردو ادب کی تحریکیں، انجمن ترقی اردو، کراچی، اشاعت چہارم، ص ۳۱۴
۱۶۔ ایوب صابر، پروفیسر، پاکستان میں اردو کے ترقیاتی ادارے، مقتدرہ قومی زبان، اسلام آباد، ۱۹۸۵ء، ص ۴
۱۷۔ قدرت نقوی، سید، (مرتبہ)، لسانی مقالات، (حصہ دوم)، مقتدرہ قومی زبان، اسلام آباد، ۱۹۸۸ء، ص ۱۵۷
۱۸۔ قدرت نقوی، سید، (مرتبہ)، لسانی مقالات، (حصہ دوم)، ایضاً، ص ۱۵۷
۱۹۔ مولوی، عبدالحق، بحوالہ قدرت نقوی، سید، (مرتبہ)، لسانی مقالات، (حصہ دوم)، ایضاً، ص ۱۵۷۔۱۵۹
۲۰۔ قدرت نقوی، سید، (مرتبہ)، لسانی مقالات، (حصہ دوم)، ایضاً، ص ۱۶۰
۲۱۔ گیان چند جین، ایک بھاشا: دو لکھاوٹ، دو ادب، فکشن ہاؤس، لاہور، ۲۰۱۲ء، ص ۲۳۷
۲۲۔ گیان چند جین، ایک بھاشا: دو لکھاوٹ، دو ادب، ایضاً، ص ۲۳۳
۲۳۔ گیان چند جین، ایک بھاشا: دو لکھاوٹ، دو ادب، ایضاً، ص ۲۳۳